مجید امجد کی نظم 'فرد' 'ننھی بھولی' اور 'یہ دو پہیے' کا تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر نبیل احمد نبیل

Abstract:

Majeed Amjad is a major urdu poet in the realm of urdu 'Nazm' in some respects, most original and innovative ever passing day,restamps the commanding position of Majeed Amjad and quite unlike his colleagues in urdu poetry, he keeps on glory in terms of poetic influence and freshness of his images. This poem 'Dou Pahlay'(two wheels) by Majeed Amjad is unique in style and poetic expression. As is common with him, he chooses most often, the ordinary images and characters in life, conventionally considered unattractive and non-appealing for poetic experience or creative expression. Two wheels, of any vehicle, would be taken by a large populace as a common sight experience, hardly worthy of a serious notice, be the theme of a powerful poem. However, Majeed Amjad tends to create exceptions out of ordinary things and through his poem, the poet has painstakingly, spread the image/metaphor of two wheels over the dominant existence of certain eternal players influencing the mankind beyond the transitory happenings. Depicting the two wheels as the earth and sky(in the very opening line), the poet transcends the compulsions and choices of life beyond the bounds of life and death, in a very eloquent, yet thought provoking manner.

مجید امجد (۲۹ جون ۱۹۱۴ء۔۔۔۱۱ مئی ۱۹۷۴ء) کی نظم 'یہ دو پہیے' کا سالِ تخلیق ۱۹۶۹ء درج کیا گیا ہے جو اُن کی تخلیق کے ترفع کا زمانہ ہے یعنی اُن کی وفات سے تقریباً چند برس پہلے کی نظم ہے۔ان کا اختصاص یہ ہے کہ وہ معمولی موضوع کا انتخاب کرتے ہیں جو سامنے کے منظر نامے سے عبارت ہوتا ہے مگر اُس معمولی مظہر سے غیر معمولی

نوعیت کی نظم خلق کرتے ہیں۔دو پہیے سائیکل کے بھی ہو سکتے ہیں اور موٹر سائیکل کے بھی،مگر یہ سامنے کی چیز ہے،اور سامنے کے مشاہدے سے ہی تعلق رکھتی ہے،جب مجید امجد جیسا باریک بین تخلیق کار سامنے کے مظہر کو دیکھتا ہے تو اسے کائنات کی وسعتوں تک پھیلا دیتا ہے۔پہیہ جدید دور کی ایجاد ہے،شاعر نے اس کو استعاراتی انداز سے لیا ہے۔اس کے ذریعے فاصلے سمٹتے ہیں۔پہیہ فاصلوں کو پاٹنے کا کام سرانجام دیتا ہے مگر یہاں شاعر نے اس کو زمین اور آسمان کی وسعتوں تک پھیلا دیا ہے۔پہیے کی حرکت کا مشاہدہ کریں تو عمومی سی بات ہے کہ پہیے کی حرکت دائروی ہوتی ہے،اور معلوم انسانی تاریخ میں وقت کے مختلف تصورات رائج رہے ہیں اور تا حال وقت کے مختلف تصور مروج ہیں ،لیکن یہ تمام تصورات موضوعی ہیں۔ان میں وقت کا کوئی بھی تصور موضوعی نہیں ہے۔مجید امجد دو پہیوں کو کائنات کے کینوس پر پھیلا دیتے ہیں۔مختلف انسانی سماجوں اور انسانی تمدنوں نے وقت کے مختلف تصورات قائم کیے،جیسے زندگی اور موت،ازل اور ابد،خیر اور شر اور آغاز اور انجام کے تصورات وغیرہ۔وقت کو کوئی دائمی تصور نہیں ہے۔سورج کا نکلنا اور غروب ہو جانا ، یہ انسانی سطح کا ایک مقرر کردہ پیمانہ ہے۔وقت تو اس قید سے بے نیاز ہے۔انسان جو بھی پیمانے بنائے ہیں ، وہ وقت کے اوپر حاوی نہیں ہیں،ایسے تمام پیمانے انسان نے اپنی سہولت اور آسانی کے لیے بنائے ہیں۔کل کو اگر طبیعیات ترقی کر لے اور کوئی پیمانہ مقرر کر دے تو موجودہ تصورِ وقت سارے کا سارا باطل ہو جائے گا۔وقت بندھا ہوتا ہے بہت سے مظاہر کائنات انسانی اقدار کے ساتھ جیسے اچھا وقت اور برا وقت کے تصورات ہیں۔وقت تو بے نیاز ہے ، ان ساری وجہ بندیوں سے، ہمارا سارا نظامِ اقدار وقت کے ساتھ جڑا ہوا ہے،اچھائی اور برائی کے افکار و تصورات کی صورت میں انسانی تاریخ میں بہت سے اقداری پیمانے وقت کے ساتھ منسلک کیے ہوئے ہیں مگر وقت تو ان سب سے ماورا ہے۔اگر ایک سماج جامد ہے تو وہاں وقت کی رفتار سست ہوتی ہے،اسی صورتِ حال کو اگر صنعتی معاشروں کے ساتھ منسلک کر کے دیکھا جائے تو وہاں ان معاشروں نے وقت کے بارے میں ایک موضوعی تصور قائم کر رکھا ہے اور اس میں وہ دنیا کی ترقی میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں،ایک طرح سے انھوں نے وقت کے متعلق معروضی تصور قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

اتنے بڑے نظام میں صرف اِک میری ہی نیکی سے کیا ہوتا ہے
میں تو اِس سے زیادہ کر ہی کیا سکتا ہوں

میز پر اپنی ساری دُنیا
کاغذ اور قلم اور ٹوٹی پھوٹی نظمیں،

ساری چیزیں بڑے قرینے سے رکھ دی ہیں
دِل میں بھری ہوئی ہیں،اتنی اچھی اچھی باتیں
ان باتوں کا دھیان آتا ہے،تو یہ سانس بڑی ہی بیش بہا لگتی ہے
مجھ کو بھی تو کیسی کیسی باتوں سے راحت ملتی ہے
مجھ کو اس راحت میں صادق پا کر

سارے جُھوٹ مری تصدیق کو آ جاتے ہیں
ایک اگر میں سچا ہوتا!
میری اِس دنیا میں، جتنے قرینے سجے ہوئے ہیں
اُن کی جگہ بے ترتیبی سے، پڑے ہُوئے کچھ ٹکڑے ہوتے
میرے جسم کے ٹکڑے ـــــ کالے جُھوٹ کے چلتے اِس آرے کے نیچے!

اِتنے بڑے نظام سے میری اِک نیکی ٹکرا سکتی تھی
اگر اِک میں ہی سچا ہوتا (۱)

(فرد)ـــــص ۴۸۴

مجید امجد کی نظم 'فرد' میں نظام کے جکڑ بند اور جبریت وکلیت پسندی کو موضوع بنایا گیا ہے، جہاں ایک 'فرد' بے بس و بے کس ہے جو نظام کے جمود کو توڑنا بھی چاہتا ہے، بدلنا بھی چاہتا ہے، مگر کچھ کر نہیں سکتا، سسٹم کے جبر میں فرد کی تنہائی اور بے بسی ہی اس نظم کا موضوع ہے۔ میں بہت بڑے نظام کا ایک چھوٹا سا پرزہ ہوں، میں اس نظام کو بدلنا بھی چاہوں تو کیا کر سکتا ہوں ۔ویسے بھی ایک انسان کے بدلنے سے سارا نظام تو نہیں بدل سکتا جب تک کہ تمام افرادِ معاشرہ سسٹم کو بدلنے کی سوچ نہ رکھتے ہوں یا اپنا بھرپور کردار ادا نہ کرنے والے ہوں، جب سارا سسٹم ہی استحصالی رویوں سے عبارت ہو تو ایسے میں ایک فرد کی سچائی بھی کچھ نہیں کر سکتی۔شاعر کے سامنے استحصالی نظام کا مکمل تانا بانا ہے اور اس میں سماج کے ہر فرد کے کردار سے ہی سسٹم میں تبدیلی ممکن ہے، بصورتِ دیگر نظام کا بدلنا کیسے ممکن ہے، شاعر نے اپنے حصے کا کام کر دیا ہے۔اپنے سخن کے ذریعے ذہنوں میں سوالات اُبھارے ہیں، یہی تخلیق کار کا ہر سماج میں بنیادی کام اور کردار ہوتا ہے، جو شاعر نے کیا ہے۔ میں نے اپنی ساری شاعری ٹوٹی پھوٹی نظمیں بڑے قرینے سے رکھ دی ہیں، دل میں اتنی اچھی اچھی باتیں ہیں، ان کا خیال آتا ہے، تو یہ سانس بیش بہا لگتی ہے، مجھ کو بھی تو کیسی کیسی باتوں سے راحت ملتی ہے، مجھ کو اس راحت میں سچا پا کر سارے جھوٹ میری تصدیق کو آ جاتے ہیں ۔ میں اگر سچا ہوں ہو تو اس دنیا میں جتنے جھوٹ بے ترتیبی سے پڑے ہوتے ہیں۔ چلتے آرے کے نیچے میری نیکی جا سکتی ہے ۔ یہاں شاعر اپنی بے بسی کا رونا رو رہا ہے اور کہتا ہے کہ میں اس نظام میں تنہا کیا کر سکتا ہوں میں اس نظام کو بدلنا بھی چاہوں تو بھی نہیں بدل سکتا۔ پہلے تو میں نے یہ کیا ہے کہ ایک کاغذ پر اپنی ٹوٹی پھوٹی نظمیں لکھ دی ہیں، آگے نظم وہ چلاتا ہے کہ مجھ کو اس راحت میں سچا پا کر، سارے جھوٹ میری تصدیق کو آ جاتے ہیں۔

وہ کہتا ہے، بے بس انسان ہوں مگر میں راحت کا ذریعہ نکال لیتا ہوں ، میں نے اپنے حصے کا کام تو کر لیا ،اسے اس میں راحت ملتی ہے کہ میں نے کچھ تو کیا ہے، مجھے اس احساس سے راحت ملتی ہے کہ میں نے کچھ نہ کرنے کی بجائے کچھ نہ کچھ کیا ہے اور سسٹم کی جبریت ،کلیت پسندی کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے ۔اس نے سسٹم

کے جبر کے آگے سرِ تسلیم خم نہیں کیا بل کہ سارے جکڑبند میں اس نے اپنے لیے راحت کی گنجایش نکال لی ہے ۔اپنی شاعری کے ذریعے اپنے حصے کی روشنی پھیلائی ہے یعنی Individual کے contribution میں اپنا role ادا کیا ہے۔

اس احساس سے اسے راحت ملتی ہے، وہ کہتا ہے کہ میری یہ راحت اتنی بڑی سچائی ہے کہ سارے جھوٹ میری اس راحت کی تصدیق پانے کے لیے تیار ہیں مگر یہ سب کافی نہیں ہیں ۔اگر یہ سب کچھ، جو کچھ میں کرنا چاہتا تھا، وہ کر لیتا اگر میری ایک نیکی، سچائی پر مبنی ہوتی تو وہ میری سچائی سے ٹکرا سکتی تھی ۔

میں جتنا کرنا چاہتا تھا، اتنا نہیں کر سکا، اگر میں اپنے Contribution میں سچا ہوتا تو سب کچھ کر لیتا میری ایک چھوٹی سی نیکی اس اتنے بڑے نظام کو درہم برہم کر دیتی ۔نظم ایک نامیاتی کل ہوتی ہے ۔سسٹم کے جبر کا ایک Cycle ہے ۔ازل سے ابد تک پھیلا ہوا ۔اس میں انسان کا حال بھی ہے اور مستقبل بھی ۔کہا فطرت کا منشا یہی ہے کہ کوئی فرعون بن جائے اور جبر کی مثال بن جائے ۔ظلم، جبر، استحصال ازل سے ہی انسان سے جُڑا ہوا ہے ۔نظام کا جبر، کلیت پسندی، دائمی حقیقت نہیں ۔ساری خلقِ خدا نسل در نسل غلامی میں پڑی رہے ۔کیا یہ انسانیت کا بنایا ہوا نظام ہے ۔ہر زمانے کا حال ہے، مستقبل ہے ۔کیا ہر دور کا یہی دستور ہے ۔یہ بنیادی بات ہے ۔ایک فرعون کا جبر حتمی ہے پھر پوری پلٹن سچائی کی طرف مراجعت کرتی ہے ،فرعون کا نظام شہنشاہیت پر مبنی یا پھر نوآبادیاتی ہو یا ظلم و استحصال کا کوئی بھی دور ہو، یہ ازل سے انسان کے ساتھ جُڑا ہوا ہے ۔یہ بھی دائمی حقیقت نہیں بلکہ جاری صورتِ حال ہے، وہ انسان کے جھوٹ اور مکاری پر مبنی ہے ۔ایک بڑی خوش آیند بات یہ ہے کہ ساری انسانی رذالتیں، ساری سفاکی، اس ظلم و جبر سے انسان کی نشاندہی کرتی ہے جو اسی موقف پر قائم ہے ۔فرعون بھی نہیں رہا، پوری پلٹن پلٹ جاتی ہے ۔یہ سارے مناظر جن میں لہو ہے، ان میں آخر کون سچا ہے ۔کیا فرعون سچا تھا ؟ یہ آخری تجزیے میں نظر آ جاتا ہے ۔کیا ظالم یا مظلوم شرافت کا مستحق کون ہے ؟ آخر میں سارا سچ سامنے آ جاتا ہے ۔شاعر کا کام قاری کو بیدار کر کے، اس کے ذہن میں سوالات کو اُجاگر کرنا ہے ۔باقی کام شاعر، قاری پر چھوڑ دیتا ہے ۔اس میں تاریخی پہلو بھی آ گیا اور جبر کا پہلو بھی ۔یہ دراصل دائمی اقدار میں سچ اور جھوٹ کے درمیان لکھی ہوئی ایک نظم ہے ۔

ع اپنی آنکھوں میں کانٹے بھر کر میری جانب مت دیکھو
میں سچ کہتا ہوں آخر سچ کے سچ پر کون اترا ہے

کیا سچائی وہی ہے ،جس کو طاقت کے ذریعے استعمال میں لایا جاتا ہے؟ یہ سارے مناظر سب کے سامنے ہیں، ان میں آخر کون ہے جو سچا ہے؟ آخر میں سامراجیت کا پتا چلتا ہے اور سچائی کا پتا چلتا ہے؟ ظالم و مظلوم برابر نہیں ہو سکتے ۔یہ سوال سیاسی نظریے سے اُٹھایا گیا اور باقی سوالات قاری کے ذہن میں پیدا کرنے کے بعد ،شاعر اپنے قاری سے توقع رکھتا ہے کہ اس کا بھی ایک کردار ہے۔ وہ قاری کے تصور کو بیدار کرتا ہے ۔سچ کے سچ پر پورا اُترنے کی بڑی قیمت دینا پڑتی ہیں، ہم چپ چاپ ظلم سہتے ہیں اور بغاوت پر نہیں اُترتے تو اس کی بڑی قیمت چکانا پڑتی ہے ۔فرعون کی جبریت کے شکار ان غلاموں میں، اپنے عہد کا جبر، اپنے عہد کی دائمی اقدار ساتھ لے کر آتا ہے

۔دراصل وہ اقدار کلیت پسندی اور جبریت کے خلاف ہوتی ہیں۔ انسان کا ضمیر اپنے عہد کے سچ کی گواہی دیتا ہے۔جبریت دائمی اور قائم بالذات نہیں ہوتی اور نہ استحصالی رویوں کو اقدار کا درجہ حاصل ہوتا ہے، طاقت کے خاتمے کے ساتھ ہی،اس کی جبریت بھی ختم ہو جاتی ہے، آج یزید کے عہد کی دائمی اقدار اس کے سچ کو بیان کرتی ہیں۔آج فرعون کے عہد کی جبریت اس کے عہد کی دائمی اقدار کی گواہی دیتی ہیں۔دائمی اقدار میں ظلم و بربریت شامل نہیں ہے۔دائمی اقدار میں سماجی انصاف اور سچ شامل ہے۔

چلتے چلتے اکثر سوچا ہے، یہ سڑکیں بھی کتنی اچھی ہیں
ان کے باعث میرے دھیان میں آجاتے ہیں، وہ سب اچھے کام
اور اچھی اچھی باتیں
جن کی خاطر، میں نے،
ارض وسما کے پہیوں کو اس پٹری پر گرداں رکھا ہے،
اور اک عمر کے بعد، اب یہ سمجھا ہوں: دُھوپ کی لو میں تپتی ہوئی یہ بجریلی
سطحیں اچھی ہیں، ان لوگوں سے
جو ان پر چلتے ہیں۔۔۔جن کے غرور کی جھوٹی ٹھنڈک کبھی بھی اُن کے دلوں میں
نہیں پگھلتی۔۔۔۔۔

چلتے چلتے اکثر میں نے سوچا ہے، میں کن لوگوں کی دنیا میں ہوں،
یہ سب کیسے ہیں، جن کی آنکھوں میں پتھرائے ہوئے پچھتاوے کبھی بھی کروٹ
نہیں بدلتے

لوگ جو اپنے سوا، ہر اک شے کی جانب بے رُخ ہیں
کس نے دیکھا، میرا دل تو بچھا ہوا ہے، ان سڑکوں پر، ان بے رخ قدموں کے نیچے(۲)ص ۵۲۷

میں یہ سمجھا ہوں کہ یہ ارض وسماں زمان ومکان کی دوڑ ہیں۔یہ عمر کے بعد میں سمجھا ہوں کہ یہ لوگ جو زمین پہ چلتے ہیں انکے دلوں کا غرور کبھی نہیں پگھلتا۔ یہ ہر جوہ کلاس کی بات ہو رہی ہے۔ یہ استحصال اور جبر کرنے والوں کی بات ہو رہی ہے کہ کسی تنہائی میں اس کا ضمیر اسے ملامت کو کرتا ہوگا۔ یہ کیسے لوگ ہیں جن کی آنکھوں میں پتھرائے ہوئے پچھتاوے کبھی کروٹ نہیں بدلتے ۔ان کی آنکھوں میں پچھتاوا ہے مگر انہوں نے اسے پتھریلا کر دیا ہے۔کروٹ بدلنا یعنی گہری نیند میں جانا اور ایک نیند سے دوسری نیند میں جانا ۔ان کے پچھتاوے عالمِ عشق میں انہیں انسان کو انسان سمجھنے کا موقع نہیں دیتی ۔

کس نے پہچانے وہ ہاتھ، کہ جن کے بس میں، ان پہیوں کی گردش کا ہر رُخ ہے، (۳)
(یہ دو پہیے)۔۔۔ص ۵۲۸

پہیہ وقت کا metapher ہے اور یہ circular ہے linear نہیں ہے جب پہیہ چل رہا ہوتا ہے تو اس

کی زد میں جو بھی آجائے، وہ کچلا جاتا ہے، اسی طرح وقت بھی چلتا رہتا ہے، اس میں استفادہ کرنے والے اپنی رفتابدل کر اس کے ساتھ چلتے رہتے ہیں، مگر اس پہیے کی رفتار کون چلا رہا ہے، کون اسے کنٹرول کئے ہوئے ہے ۔وقت ساقط بھی نہیں ہے ۔ پہیہ کسی کے لیے رُکتا بھی نہیں، اِس کا نظام اس کے متعلقات متعین ہیں ۔ پہیہ پہ سوار ہونے والے اس سے استفادہ کرنے والے اس کے نیچے آکر کچلے، جانے والے کردار بولتے ہیں ۔ یہاں استعجاب یہ ہے کہ اس کی لگامیں کس کے ہاتھ میں ہیں ۔کون اسے چلاتا ہے، کون اس کی رفتار بدلتا ہے۔استحصالی افراد نے اپنی ذات کو مرکزہ بنا کر دوسرے انسانوں کو کیڑے مکوڑے سمجھا ہوا ہے ۔

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں (۴)

(فانی بدایونی)

یہ وہی جبر ہے ۔جو مجید امجد کے ہاں یہ سوال ہے کہ جبر کی ڈور کس کے ہاتھ میں ہے ۔ یہ کسی کو معلوم نہیں مگر اس کے جبر تلے جو لوگ کچلے جاتے ہیں، ان کا کیا قصور ہے ۔شاعر اسے انسان کا المیہ بنا دیتا ہے ۔ کہ تقدیر کی جبریت انسان کو پامال کرتی ہے۔انسان کو اپنے حصہ کا کردار ادا کرنا ہے ۔وقت کی رفتار پہ قابو پانا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے مگر انسان یہ مسئلہ حل نہیں کر پایا۔انسان کا کام تگ و دو کرنا ہے ۔اگر انسان اس مسئلے کو حل کر لے تو انسان اور خدا میں کیا فرق رہ جاتا ہے ۔اپنے مسئلہ کے حل کی چابی تو انسان کے پاس نہیں ہے ۔ ہمارے سامنے جو منظر ہو ،اسے ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں ۔لوگ جو اپنے سوا ہر جانب دیکھ رہے ہیں، اور جو سب کے وسائل پہ قابض ہیں، کسی نے دیکھا ہے کہ میرا دل بچھا ہوا ہے، ان سڑکوں پہ ۔کسی نے دیکھے ارض و سما کے پہیے، ان پتھریلی سڑکوں پہ ۔انسان نہ وقت کو روکنے پہ قادر ہے، نہ اس کو چلانے پہ قادر ہے، نہ اس سے استفادے پہ قادر ہے ۔اس پہ صرف ایک بے نیاز ذات قادر ہے۔ وقت کے ہاتھوں کچھ لوگ مستفید ہوتے ہیں اور کچھ اس کے تلے کچلے جاتے ہیں ۔ شاعر چاہے، مجید امجد ہو یا کوئی اور شاعر اس کا کام محرومیت ظاہر کرنا ہے ۔مجید امجد نے اپنے لمحہ موجود کی مہلت کو دوسروں کے تصور میں بدل دیا ہے۔ایک طرف انسانوں تقدیر کے جبر کے شکنجے کا سامنا ہے تو دوسری طرف لوگ جبریت کے ہاتھوں، استحصال کا شکار ہیں ۔

چلتے پہیوں میں چکراتی ہیں جھنکاریں، چلتے گُروں کی
پیڈل روک کے دیکھو، زنجیروں کے دندانوں میں کٹتے بول اٹھتے ہیں (۵)

(یہ دو پہیے) ص۔۔۔۵۴۷

سائیکل مجید امجد کی زندگی کا اہم پہلو ہے، انھوں نے سائیکل چلائی ۔ یہاں سائیکل کے کتوں کو، بھونکنے والے کتوں کے ساتھ منسلک کیا ہے ۔وقت کا پہیہ بھی چل رہا ہے، اتنی رفتار اور بے نیازی سے مگر اس کے دائرہ کار میں انحراف کی شاخیں بھی مل جاتی ہیں ۔ وقت خود فیصلہ کرتا ہے وہ انسان کی مرضی سے نہیں چلتا۔ہم اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہیں۔ انصاف بھی ہو جاتا ہے ۔انھوں نے سائیکل کے پہیے اور وقت کا بڑی خوب صورتی سے

توازن قائم کیا ہے۔وقت کا پہیہ اپنی رفتار سے، اپنی بے نیازی سے چلتا ہے۔انسان کو ہجر کی شب میں اپنی بے نیازی کی وجہ سے وقت رُکا ہوا معلوم ہوتا ہے جب کہ وہ اپنی رفتار سے ہی چل رہا ہوتا ہے۔حال آں کہ اس کو چلانے والا ہاتھ بھی ہے، جو اسے توازن سے چلا رہا ہے۔ جب چین ڈھیلی ہو جائے تو سائکل تو اپنی جگہ ہے، مگر سائکل چلے گی نہیں۔اسی طرح وقت کو چلانے والا بھی ہے جو وقت کو اپنی رفتار سے چلا رہا ہے۔ جب انسان خوشی کے عالم میں ہو،تو اپنے پاؤں زمین پر نہیں پڑتے ،ایسا لگتا ہے، وقت کو پر لگ گئے ہیں۔ بہت زیادہ رنجیدگی کے عالم میں انسان کو ایسا لگتا ہے، جیسے وقت تھم گیا ہے، حال آں کہ ایسا کچھ نہیں ہوتا۔سائکل کا بھی یہی معاملہ ہے،، چلانے والا اسے چلاتا ہے مگر چین ٹوٹ گئی ہے،تو وہ چل نہیں پا رہا ہو۔تا اسی طرح شب ہجر میں رات تو کٹ رہی ہوتی ہے مگر ہجر زدہ کی رات نہیں کٹتی۔

ع۔لوگ جو اپنے سوا ہر اک شے کی جانب بے رُخ ہیں، یعنی لوگ دوسروں کے وسائل پر قابض ہونے کی کوشش میں ہیں۔

اپنی دُھن میں چلتے رہیو، چلتے پہیوں میں چکراتی ہیں جھنکاریں، چلتے گُروں کی
پیڈل روک کے دیکھو، زنجیروں کے دندانوں میں کتے بول اُٹھتے ہیں(۶)

(یہ دو پہیے)۔۔۔ص۵۲۸

تحرک زندگی ہے۔ پہیہ چل رہا ہے،تو جھنکار ہوتی ہے۔اگر پہیہ حرکت میں نہ ہوتو، نہ وہ تحرک پیدا ہوگا اور نہ ہی جھنکار پیدا ہوگی۔مجید امجد نے انسانی کاوش کو فطرت کی کاوش سے ملایا ہے، یعنی ایک پہیہ جو فطرت اور قدرت اور وقت کے دائرہ کا ہے ،اور دوسرا پہیہ وہ ہے جو انسان کی زندگی کا ہے، اس لیے اپنے دائرے میں رہتے ہوئے ،انسان کا جو contribution ہے، اسے انسان نے اپنے دائرے میں رہتے ہوئے طے کرنا ہے۔اب یہ انسان پر ہے کہ وہ حرکت کے دائرے کا انتخاب کرتا ہے یا مجہولیت کے دائرہ پر قائم رہتا ہے یا معذوری کے دائرے پر قائم رہتا ہے۔اگر انسان کی زندگی حرکت سے عبارت ہے،تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان نے اپنی کاوش اور تگ و دو سے اس دائرہ کو حرکت میں لانے کی سعی کی ہے۔انسان نے فطرت کے ہاتھوں مجہولیت کا کردار ادا نہیں کیا،اب اس پہیے کی حرکت کا دارو مدار انسان پر ہے۔ پیڈل روک کر دیکھو۔اس سے مراد سکوت اور ماندگی کا وقفہ ہے۔ یعنی

ع آگے چلیں گے دم لے کر

غور وفکر کرتے چیزیں ویسی نہیں ہوتی جیسی کہ نظر آتی ہیں،چیزوں کی ماہیئت پر غور کرنا چاہیے۔ Review کرتا ہے، سارے مناظر کا اُن چیزوں کا جو فطرت اپنے اردگرد انسان کو نظر آتی ہیں یعنی اس بات پر غور کرتا ہے کہ جو کچھ جو ہو رہا ہے۔کیا وہ putomatic System کے تحت ہے یا اس میں کچھ انسان کا اپنا بھی حصہ ہے یا پھر انسان نے اپنے حصے کا کیا کردار ادا کیا ہے ،اور آگے آنے والوں کے لیے کون سی راہیں ہموار کی ہیں ۔،یعنی ایک بڑے دائرے کے اندر انسان کا جو اپنا دائرہ ہے، اس میں، اس نے کیا کاوش کی۔یعنی اندھا دھند

پیڈل مارنے کی بجائے غور و فکر سے کام لینا چاہیے اور جو سائیکل انسان کے ہاتھوں میں ہے یعنی پیڈل اور handle اس کو انسان نے کس طرح قابو میں رکھا ہوا ہے۔

ع زنجیروں کے دندانوں میں
کتے بول اٹھتے ہیں (۷) ص ۵۲۷

یہ شعوری سطح پر شاعر نے دوہرے معنی پیدا کرتے ہوئے بات کی ہے۔میری جانب دیکھو سو وسوسے ہیں۔ دوسری جانب سے دیکھو تو وسوسے ہی وسوسے ہیں، انسان کے سفر کو کھوٹا کرنے والے کردار" کتے "ہیں ۔ یہ کتے رات بھر بھونکتے ہیں۔ چیزیں ویسی نہیں ہوتی ہیں، جیسی نظر آتی ہیں ،ان کا جائزہ لینا چاہیے۔اس کا کام خوفزدہ ہو کر ان کا تعاقب کرنا نہیں یعنی کتوں سے اپنا دامن بچا کر ضرور نکلنا ہے، مگر ان کے تعاقب میں نہیں چل پڑنا ۔ ورنہ انسان نے اپنا ہی سفر کھوٹا کر لیا۔

ننھی، بھولی، میلے میلے گالوں والی، بے سدھی اِک بچی/تیری جانب دیکھ رہی ہے، دیکھ اس کی آنکھیں تیری توجہ کی پیاسی ہیں/
اس کی نازک، بے حس ٹھوڑی کو اپنی انگلی کی سنہری پور سے مَس تو کر،اور اس سے اتنا تو پُوچھ اچھی بلو! کیوں چپ ہے؟ "/
اور جب وہ منہ پھیر کے اپنی آنکھیں اپنے ہی چہرے پہ جھکا لے/تو ہی بڑھ کر اس کے ماتھے کو اپنے ہونٹوں سے لگا لے، ہاں ایسے ہی/
کیوں، اس جھنجھلو نے تجھ سے کہا کیا؟ /یہ کیا؟ تیری آنکھیں بھیگ گئیں۔۔۔۔؟ کیوں؟/ساتوں آسمانوں کے مالک،
اتنے پتلے دل والے مالک!ہم روز اس چہرے کی کٹھائیں سہتے ہیں،/ہم تو کڑا کر لیتے اپنا جی ،ایسے موقعوں پر!(۸)

(ننھی بھولی) ص۔۔۔۵۳۹

خدا کی قدرت کی وسعت اتنی ہے کہ وہ سات آسمانوں کا مالک ہے مگر دل بہت چھوٹا سا ہے ۔جیسا کہ فیض احمد فیض نے کہا تھا:

اک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے (۹)

اتنے پتلے دل والے مالک!ہم بھی روز اس چہرے کی کٹھائیں سہتے ہیں،
ہم تو کڑا کر لیتے ہیں اپنا جی، ایسے موقعوں پر!(۱۰)

(ننھی بھولی) ص۔۔۔۵۳۹

دل دہلا دینے والی بات ہے، یہ کائنات بہت وسیع ہے، اس پر ہمارا کوئی اختیار نہیں ۔اتنی بڑی کائنات کے مالک، اتنا بڑا تیرا اختیار ہے، تیرا دل اتنا چلا ہے ۔تیرا نام رحمٰن ہے ۔تو کہتا ہے، میں شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں، میں دعاؤں کے سننے والا ہوں، تم ایک قدم بڑھاؤ تو میں سو قدم بڑھاتا ہوں ۔ہم تو اوکھے سوکھے ہو کر یہ سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں مگر یہ سب کچھ تو کیسے برداشت کر لیتا ہے ۔ خدا کا ضبط استعجابیہ طور پر یہاں استعمال کیا ہے ۔ بظاہر ایک میلی کچیلی بچی تھی، جس کے حسن اور معصومیت کو غربت نے مار دیا تھا۔"ننھی بھولی" دراصل زندگی کا ایک نام ہے ۔جس کو فطرت اور سماج کے جبر کے اپنا نشانہ بنا لیا ۔ہم ظلم و جبر کو دل کڑا کر کے دیکھ

لیتے ہیں، مگر تو رحمٰن ہے، جہانوں کو پالنے والا ہے، تو قادر ہے، تیرے ہوتے ہوئے، تیرے علاوہ بھی، تیرے اس جہاں میں کیا ہو رہا ہے؟ اگر یہ تیری منشا ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے اور اگر یہ تیری منشا نہیں ہے تو ایسا کیوں ہو رہا ہے ۔مجید امجد کے نظامِ افکار و اقدار میں جبر و ظلم کی مثال ایک پوری وسعت کا حاطہ کئے ہوئے ہے ۔اس نے ظلم و جبر کو اپنے خاص موضوع کے تحت بیان کیا ہے ۔شاعری میں معنی قاری سے مبہم ہے ۔شاعر کا ہر تخلیقی لفظ اس کے عہد کا مطلع نہیں ۔میرؔ کا عہد زوال کا عہد ہے مگر اس عہد میں ہر شخص زبان و بیان کی فصاحت و بلاغت اور مضامین سے واقف ہے، مگر اس عہد میں زندگی تنوع کے ساتھ ہے، اس طرح سادہ نہیں ۔یہ کسی اور بحر میں نظر ہے، یہاں دو نمبر لوگ ناجائز ذرائع سے وسائل پر قابض ہو جاتے ہیں اور genuine شخص کو اور genuine شخص کی آواز کو پیچھے دھکیل دیا جاتا ہے اور اس کی آواز صحیح مقام تک نہیں پہنچ پاتی ۔

حوالہ جات:

(۱) مجید امجد، **کلیاتِ مجید امجد** (مرتبہ: ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا) (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، (فرد۔۔۔ص ۲۸۳)۔

(۲) ایضاً۔۔۔(یہ دوپہے۔۔۔ص ۵۲۷)۔

(۳) ایضاً۔۔۔(یہ دوپہے۔۔۔ص ۵۲۸)۔

(۴) فانی بدایونی، **کلیاتِ فانی بدایونی**

(۵) مجید امجد، **کلیاتِ مجید امجد** (مرتبہ: ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا) (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء) (یہ دو پہیے۔۔۔۵۲۷)۔

(۶) ایضاً۔۔۔(ص۔۔۔۵۲۸)۔

(۷) ایضاً۔۔۔ص۔۔۔۵۲۷)۔

(۸) مجید امجد، **کلیاتِ مجید امجد** (مرتبہ: ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا) (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء) (منحنی بھولی۔۔۔ص ۵۳۹)۔

(۹) فیض احمد فیض، **نسخہ ہائے وفا** (کارواں پبلشرز، لاہور) (ص۔۔۔)۔

(۱۰) مجید امجد، **کلیاتِ مجید امجد** (مرتبہ: ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا) (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء) منحنی بھولی۔۔۔ص ۵۳۹)